باتونی کچھوا

باتونی کچھوا

اشرف صبوحی

مکتبہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

جنوری ۹۴ء

تعداد 1000

قیمت 4/50

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

باتونی کچھوا

اگلے زمانے کا قصہ ہے۔ ہندستان میں کوئی راجا تھا اور ایک کچھوا۔ دونوں حد سے زیادہ بولنے والے۔ راجا ہر وقت بولے جاتا اور کچھوے کی اپنی جگہ ایک دم تالو سے زبان نہیں لگتی تھی۔

راجا کا نام برہم دت تھا۔ اس کی حکومت بڑی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ رہنے کے لیے بڑے بڑے محل تھے۔ کروڑوں آدمیوں پر وہ راج کرتا تھا۔ لیکن اتنا بڑا راجا ہوتے ہوئے پرجا میں اس کی ذرا عزّت نہ تھی۔ راج کے چھوٹے بڑے سب اس کو حقارت سے دیکھتے۔ جب کبھی وہ اپنے سونے کے رتھ میں بیٹھ کر جس میں سفید بیل جُتے ہوئے ہوتے سیر کو نکلتا، آگے پیچھے پیادے ہٹو بچو کرتے دوڑتے، تو فقیر تک اسے دیکھ کر کہتے: "وہ لُترا باتونی جا رہا ہے" بیلوں کی تو ناتھیں بھی ہیں اس کی زبان میں لگام نہیں۔ بولے جاتا ہے۔ بولے جاتا ہے۔ اپنے آگے کسی کو بولنے ہی نہیں دیتا۔ جہاں یہ ہو وہاں کیا مجال جو کوئی دوسرا بات تو کرلے۔ ایک دن میں اس قدر فضول بکواس کرے گا کہ ہری داس نے ساری عمر میں بھی نہ کی ہوں گی۔

اس سے بھول کر بھی اپنا بھید نہیں کہنا چاہیے۔ کہا اور اس کا پیٹ پھولا کوئی راز کی بات اس کے دل میں ٹک نہیں سکتی۔ اسے بھنبق ناٹی سمجھو۔ جس کو ڈھنڈورا پٹوانا ہو وہ اس سے اپنی بات کہے۔

ہری داس اس بالتونی راجا کا وزیر تھا۔ وہ راجا کے ساتھ ہوتا اور لوگوں کی یہ باتیں سنتا تو اسے اپنے راجا کی حالت پر بڑا رنج ہوتا۔ ہاتھ ملتا رہ جاتا کہ ایسا بڑا راجا اور اپنی رعایا میں اتنا بدنام۔ وہ بہت سوچتا کہ کس طرح راجا کی اس بیماری کا علاج کرے۔ لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آتی۔ جتنا غور کرتا اتنا ہی مشکل نظر آتا۔ آدمی کی فطرت کو انسان کیا بدل سکتا ہے۔ خدا ہی بدلے تو بدلے۔

بالتونی کچھوا راجا کے باغ کے تالاب میں رہتا تھا۔ اسے راجا سے زیادہ باتیں کرنے کی دُھن تھی۔ راجا آدمیوں سے باتیں کرتا تو کچھوا توتوں، بندروں، مچھلیوں اور چڑیوں کا سارے دن مغز چاٹتا رہتا۔ وہ بچارے سنتے سنتے پریشان ہو جاتے اور اسے کوسنے لگتے۔

مچھلیاں چونکہ اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں اس لیے ان پر کچھوے کے لترا پے کا عذاب سب سے بڑھ کر تھا۔ جب وہ مل کر بیٹھتیں تو آپس میں کہتیں، کچھوا کیا ہے ہمارے لیے تو مصیبت ہے۔ بدذات سارسوں سے ہمارے سارے بھید کہہ دیتا ہے۔ ہماری چھپنے کی ساری جگہیں ان کو بتادی ہیں۔ اب وہ ظالم، جس وقت اُن کے دل میں آتا ہے ہم کو ڈھونڈ کر نکالتے اور کھا جاتے ہیں۔ اور سنو جوانا مرگ نے ہیرامن توتوں کے بادشاہ سے بندروں کی بات کہہ دی کہ وہ تمھاری دُم پر پھبتیاں کس رہے تھے۔ جس سے توتوں اور بندروں میں ایسا بیر بندھا ہے، کہ خدا ہی

سلوک کرائے تو کرائے۔

چڑیاں مچھلیوں کی باتیں سُن کر کہتیں کہ "یہ مُوا تو برہم دت کا بھی گرد نکلا۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس کی بدولت دنیا میں کوئی بڑا فساد نہ اُٹھ آئے۔ خیر دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ راجا کو گرمیوں کے موسم میں اپنے لاؤ لشکر سمیت پہاڑ پر جانے دو۔ عجب نہیں اس کے غارت ہونے کی بھی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔"

گرمی آئی۔ لوئیں چلنے لگیں۔ راجا ہمالیہ کے پہاڑوں میں جہاں اس نے اپنے محل بنا رکھے تھے چلا گیا۔ لیکن کچھوے کو کون پوچھتا۔ وہ اپنے تالاب ہی کے اندر موجیں مارا کیا۔ ہری داس وزیر بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ اسے راج کے بہت سے کام پورے کرنے تھے۔ سارے بندوبست کر لیتا تو جاتا۔ ایک دن صبح ہی صبح وہ باغ میں آیا اور پھرتے پھرتے تالاب کے پاس جا نکلا۔ وہاں اس نے ایک نیا تماشا دیکھا۔ دو ہنس اُڑتے اُڑتے آئے اور تالاب کے سامنے گھاس پر جہاں کچھوا دھوپ پڑا سینک رہا تھا اُترے۔

کچھوا دیکھتے ہی فوراً بولا: کہاں سے آنا ہوا۔ کہاں جا رہے ہو؟

ہنس: سردیاں گزارنے آئے تھے۔ وہ گزر گئیں۔ اب اپنے وطن جا رہے ہیں۔

کچھوا: تمھارا وطن کہاں ہے؟

ہنس: ہمالیہ پہاڑ کا نام نہیں سنا؟

کچھوا: نام تو سنا ہے۔

ہنس: وہاں ایک بڑا خوبصورت باغ اور باغ کے اندر محلات اور اونچے اونچے درخت ہیں۔

کچھوا: وہاں تم رہتے ہو؟
ہنس: ہاں۔ دنیا کی جنت اسے کہتے ہیں۔
کچھوا: اور اس جگہ کا خاص نام کیا ہے؟
ہنس: روپی پربت کی سنہری چوٹی۔
کچھوا: نام تو بڑے پیارے ہیں۔ میرا تو جی للچانے لگا۔ اچھا یہ تو بتاؤ وہاں کوئی تالاب بھی ہے؟
ہنس: تالاب تو نہیں۔ ہاں۔ ندیاں، اور دریا بہتیرے۔ تالاب، جوہڑ ان کے آگے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ آؤ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ دیکھنا کیسی بہار ہے۔

کچھوا ایک ہی تالاب کے اندر رہتے رہتے اکتا گیا تھا۔ اس کی زبان نے چاروں طرف دشمن ہی پیدا کر دیے تھے۔ اسے راجا کے باغ میں رہنے سے اب زیادہ خوشی نہیں رہی تھی۔ اُدھر ہمالیہ کا ذکر سنا۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر کرتا کیا۔ وہاں جانے کا رستہ معلوم نہ تھا۔ اس کے پَر نہ تھے۔ اور تالاب میں سرنگ نہیں۔ تلملانے لگا۔

ہنس: (کچھوے کو چپ دیکھ کر) کیوں کیا ارادہ ہے۔ چلتے ہو؟
کچھوا: (کھسیانا سا ہو کر) بھلا میں بچارہ پہاڑ پر کیسے جا سکتا ہوں۔ تمھارے ساتھ اڑنے کو میرے پَر کہاں؟
ہنس: اس کی فکر نہ کرو۔ پَردار اڑتے پھرتے ہیں۔ بے پَر کا خدا حافظ۔ ہم تمھیں لے چلیں گے۔
کچھوا: (شوق میں منہ پھلا کر) بھائی وہ کس طرح؟
ہنس: وہ اس طرح کہ ایک لکڑی ہم لاتے ہیں۔ اس کے دونوں

سرے ہم اپنی چونچوں میں پکڑ لیں گے۔ بیچ میں تم اسے منہ سے پکڑ کر لٹک جانا۔ مضبوط پکڑے رہنا۔ بس سمجھ لینا کہ دو سیانوں میں پہنچ گئے۔

کچھوا: یہ تو بڑا آسان لگتا ہے۔ میں لکڑی پکڑ کر لٹک سکتا ہوں۔

ہنس: لو تو تیار ہو جاؤ۔

کچھوا: تیار ہوں۔ لاؤ لکڑی۔

ہری داس جو وہیں قریب ہی ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا کچھوے اور ہنس کی باتیں سن رہا تھا، دل میں کہنے لگا کہ ہنسوں نے ترکیب تو خوب نکالی۔ مگر یہ کچھوا پہاڑ پر ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ تمام رستے اپنے منہ کو بند رکھے۔ زبان پر تالا ڈال لے اور ایسا ممکن نہیں۔ اس کی زبان اور تالو سے لگی رہے؟ اس کی بولنے کی عادت پیدائشی ہے۔ وہ کہاں جائے گی۔

ہری داس تو اپنے دل میں یہ کہتا ہوا محل میں چلا گیا اور وہاں سے سفر کا سامان لے کر راجا کے پاس پہاڑ پر روانہ ہوا۔ یہاں ہنس ایک لکڑی لائے۔ اس کے دونوں سرے دونوں نے اپنی اپنی چونچوں میں لیے۔ بیچ میں کچھوے صاحب لٹک گئے۔ ہنس اڑے۔ کچھوا بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔

ننھی ننھی مچھلیوں نے تالاب کے پانی سے سر نکال کر کہا۔ "خدا حافظ! بھائی باتونی کچھوے! اب اُلٹے نہ آنا۔ جہاں رہو خدا تمھیں خوش رکھے۔"

کچھوے کے لیے جواب نہ دینا قیامت تھا۔ اس کے دل میں تو آئی کہ کہوں مجھے کیا پڑی ہے جو جنت سے دوزخ میں آؤں۔ رکھو اپنے گندے تالاب کو اپنے پاس۔ میں اس پر تھوکتا بھی نہیں۔ لیکن منہ میں لکڑی

تھی اور ہوا میں اُدھر۔ اس ڈر سے کچھ نہ بولا کہ لکڑی منہ سے چھوٹی اور پھر تالاب میں غوطہ کھایا یا زمین پر گر کر چکنا چور ہوا۔

ہنس ہوا میں اڑتے چلے جاتے تھے۔ نیچے کبھی میدان آتے کبھی جنگل، کبھی گانو کبھی شہر۔ کہیں کھنڈر کہیں بستیاں۔ کہیں دریا کہیں پہاڑیاں اور جب کبھی جہاں کہیں وہ دم لینے کو ٹھہرتے، کچھوے کو جتاتے رہتے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ ہوشیاری سے لکڑی مضبوط پکڑے رہنا نہیں تو گر پڑوگے اور جان جاتی رہے گی۔

وہ اُڑتے چلے جارہے تھے کہ کھیت میں کام کرتے کرتے ایک عورت کی نظر جو اونچی ہوئی تو کیا دیکھتی ہیں کہ دو ہنس ایک کچھوے کو لٹکائے اُڑے جارہے ہیں۔ عورت نے جو یہ سیر دیکھی تو غل مچا کر کہنے لگی لوگو! یہ نیا تماشا بھی دیکھا۔ دو بطخیں ایک کچھوے کو لکڑی میں لٹکائے اُڑی چلی جاتی ہیں۔

کچھوے کو یہ سُن کر بڑا غصہ آیا اور وہ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بڑھیا تجھے کیا۔ تو یہ کہنے والی کون ہوتی ہے۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور غصے میں ایسے دانت بھینچے کہ آدھی لکڑی چبا ڈالی۔ بہر حال بولا نہیں۔

خدا خدا کرکے آخر ہنس پہاڑوں میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں برہم دت کے گرمائی محل تھے۔ محل کی اردگرد کی بستی کے لڑکوں نے ہنسوں اور کچھوے کو اس طرح دیکھا تو انھوں نے پتھر اور لکڑیاں اُچھال اچھال کر یہ کہنا شروع کیا۔ "کوجو کو تجوا اپنی کوڑی دے جاؤ۔ ہماری کوڑی لے جاؤ۔ نہیں تو موٹے کچھوے ہی کو پھینک دو۔ ہم اس کی یخنی پکا کر پییں گے

اب کچھوے صاحب میں چپ رہنے کی کہاں تاب تھی۔ اس نے حلق پھاڑ کر کہا "یخنی"۔ اور یہ کہنا چاہتا تھا "کُتّے کے بچّو! یخنی پکاؤ اپنے باوا کی" لیکن ابھی یخنی کی 'ی' بھی اس کی زبان سے نہیں نکلی تھی۔ منہ کھلا ہی تھا کہ لکڑی چھوٹ گئی ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا چلا اور ٹھیک باتونی راجا کے محل کی انگنائی میں جہاں وہ اور اس کے سارے درباری بیٹھے ہوئے تھے گر کر بتاشے کی طرح چورم چور ہو گیا۔

ہری داس وزیر اور دوسرے آدمی کچھوے کو اٹھانے کے لیے دوڑے۔ پاس جا کر جو دیکھا تو اس کی کوئی ہڈی سلامت نہ تھی اور وہ بالکل مردہ تھا۔

راجا برہم دت نے اپنے وزیر ہری داس سے پوچھا "تم اس سے کیا شگون لیتے ہو۔ اس واقعے کو ہم کیا سمجھیں؟ یہ کس بات کی علامت ہو سکتی ہے؟ کیا کچھوے کا اس طرح آسمان سے ٹپکنا ہم پر کسی عذاب آنے کا نوٹس تو نہیں؟"

ہری داس: نہیں مہاراج! آپ وہم نہ کریں۔ اسے دو ہنس لے جا رہے تھے۔ ان سے چھوٹ کر گرا ہے۔ حکم ہو تو اس کا قصّہ عرض کروں۔

راجا: تم کو معلوم ہے؟

ہری داس: جی ہاں۔

راجا: اچھا سناؤ۔

وزیر نے کچھوے اور ہنسوں کی باتیں جو راج محل کے باغ میں سنی اور دیکھی تھیں، سب راجا کو سنا دیں۔ راجا خاموش یہ کہانی سنتا رہا اور دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہنے اور سوچنے کے بعد بولا "اچھا تو یہ واقعہ ہے۔ بچارے

کی موت اس طرح آئی۔ وہ اپنی زبان کو قابو میں نہ رکھ سکا اس لیے یہ حادثہ پیش آیا۔ نہ بولتا نہ مارا جاتا۔ کیوں؟"

ہری داس مہاراج!

راجا پھر ایک دفعہ سوچ میں پڑ گیا اور کچھ کہنے لگا "ہری داس! مجھ کو شبہہ ہوتا ہے کہ میں بھی بعض اوقات بہت زیادہ باتیں کرتا ہوں۔ میری زبان بھی قابو میں نہیں رہتی۔"

درباری ہری داس کا منہ دیکھنے لگے۔ انھیں توقع تھی کہ وزیر راجا کی خوشامد میں اس کی تردید کرے گا۔ اور کہے گا کہ نہیں مہاراج آپ سے کم بولنے والا تو دنیا میں کوئی نہیں۔ حضور تو جہاں بولنا چاہیے وہاں بھی نہیں بولتے۔ آپ کے منہ سے تو پھول جھڑتے ہیں۔ اس لیے آپ کے بولنے سے سارا دربار خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن ہری داس نے ان باتوں میں سے ایک بات نہیں کہی، بلکہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور راجا کے چہرے کو غور سے دیکھ کر بولا۔

"مبارک ہے وہ ملک جس کا راجا اپنی غلطیوں کو جان لے۔ بھول چوک آدمی سے ہوتی ہے۔ راجا بھی فرشتہ نہیں۔ مٹی کا بنا ہوا انسان ہے۔ اور انسان کی خاص کر اس انسان کی جسے خدا نے لاکھوں جانوں کا مالک بنایا ہے یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ اگر گنتے گنتے بھول جائے، تو پھر گننے لگے۔"

راجہ: اور وہ راجا کیوں نہ بھاگوان ہو۔ اس راجا کی خوش نصیبی جسے تیرے جیسا نیک صلاح دینے والا وزیر میسر آجائے۔ ہم سونے کا کچھوا بنا کر اپنے محل میں رکھیں گے تاکہ اس واقعے کی یادگار رہے۔ اور جب میں اسے دیکھوں مجھے یاد آجائے کہ زیادہ باتیں کرنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔

چنانچہ محل کے دیوان عام میں ایک ستون پر سونے کا کچھوا نصب کیا گیا۔ جب راجا اسے دیکھتا تو فوراً یاد آجاتا کہ باتونی کچھوے کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ اور فضول زبان چلانا انجام کار نقصان ہی دیتا ہے۔

اس کے بعد راجا نے ہری داس سے خواہش کی کہ مجھے اور بھی ایسی باتیں بتاؤ جو راجاؤں کے لائق ہیں۔ جن سے میری سمجھ بوجھ بڑھے اور راج میں زیادہ نام ہو۔ ہری داس نے راجا کو بہت سی اچھی اچھی باتیں بتائیں راجا نے اپنی زبان پر قابو رکھنا سیکھ لیا۔ اس کے بعد وہ کبھی بے ضرورت نہیں بولا۔ اور اس کی رعایا نے پھر اسے کبھی حقارت سے دیکھا نہ اس کی بے عزّتی کی۔

بونا درزی

ایک بونا درزی تھا۔ مگر جتنا ہاتھ پیر کا چھوٹا اتنا ہی تیز فتنہ کہنا چاہیے۔ بازار کے ایک کونے میں اس کی دکان تھی۔ سارے دن وہاں بیٹھا سوئی چلایا کرتا۔ بہار کے موسم میں ایک دن یہ اپنی دکان کے اندر پہلو کے دروازہ کے پاس بیٹھا کام کر رہا تھا۔ عجیب وضع تھی۔ ننھی ننھی سی چمکدار آنکھیں۔ سوکھے سوکھے پانو چھوٹے اور گھنائے ہوئے سر کے بال، لال تکّا سے سیدھے۔ لیکن آواز بڑی مردانہ۔ کڑکتی ہوئی۔ آپ اپنا کام کرتے جاتے اور گاتے جاتے تھے۔

اتنے میں ایک غریب عورت سڑک پر سے چٹنی اچار، مربّے کی آواز لگاتی ہوئی گزری۔ چٹنی اچار مربے کی صدا سُن کر جناب کے منھ میں پانی بھر آیا۔ زبان چٹخارے لینے لگی۔ کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر پکارا۔

"او چٹنی اچار والی، ادھر آ۔ اگر تیری چٹنیاں اچار اچھے ہوئے تو میں سب کے سب خرید لوں گا۔ دیکھ ایسے گاہک قسمت سے ملتے ہیں۔"

عورت: (کھڑکی کے پاس آکر) تم بلا سے ہو؟

درزی: ہاں اور کیا کوئی شیطان یا فرشتہ بلائے گا۔

عورت: تو لو کیا لیتے ہو۔

درزی: کھڑکی میں سے کہیں سودا ہوتا ہے۔ اندر آ۔

عورت: کدھر سے آؤں؟

درزی: رستہ نہیں سوجھتا۔ وہ سڑک پر کیا دروازہ ہے۔ عورت اپنا بوجھل ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے تین سیڑھیاں چڑھ کر دکان کے اندر آئی اور چٹنیوں، اچاروں مربّوں کے مرتبان نکال کر ایک قطار میں درزی کے سامنے رکھے اور ایک ایک چیز کی تعریف کرنی شروع کی۔ درزی نے سب کے ڈھکنے کھول کھول کر دیکھا۔

درزی: (چٹنی کے ایک جار کو سونگھ کر) یہ میٹھی چٹنی ہے۔

عورت: ہاں۔

درزی: معلوم تو مزیدار ہوتی ہے۔

عورت: بہت مزیدار۔ سب تول دوں۔

درزی: پہلے چھٹانک بھر تو دو۔ بانگی تو دیکھوں۔ جیسی سمجھتا ہوں اگر ویسی نکلی تو پھر جب دوسری دفعہ آؤ گی۔ تو سب لے لوں گا۔

عورت کو امید تھی کہ جس طرح گڑگڑا کر اس نے بلایا ہے۔ سارا ٹوکرا خالی کرالے گا۔ بڑے غصّے کی نگاہوں سے بونے درزی کو دیکھا اور چھٹانک بھر چٹنی دے روانہ ہوئی۔

درزی اچار والی کے جانے کے بعد اپنی ننھی ننھی ٹانگیں پھیلا کر، اللہ میاں اپنے شکر خوروں کو کس طرح شکر دیتے ہیں۔ آج ناشتے میں روکھی روٹی تھی۔ چٹنی والی کو بھیج دیا۔ چٹنی بھی کیسی میری بھاؤن کی۔

بھاؤں کی چیز آدمی کو بڑی طاقت دیتی ہے۔ اس کے کھاتے ہی میرے ہاتھ پاؤں میں غیر معمولی چستی آجائے گی۔ پھر انتظار کیا۔ کھانا چاہیے۔ ناشتے کا وقت بھی آ گیا۔

یہ کہہ کر اس نے الماری میں سے ڈبل روٹی نکالی قینچی کے پھل سے اس کا ایک توسٹ کاٹا۔ اور چٹنی اس پر لگا کر سونگھا۔

درزی: (آپ ہی آپ) خوشبو تو اچھی ہے۔ مزہ بھی ضرور اچھا ہوگا۔ لیکن سامنے کا ذرا سا کام ہو جائے تو کھاؤں معدہ کو ذرا للچانے دو۔ کہتے ہیں اس طرح ہضم خوب ہوتا ہے۔

اس نے روٹی اپنے پہلو میں رکھ لی اور جھپاک جھپاک سوئی چلانی شروع کی۔ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ نہایت پھرتی کے ساتھ ہاتھ چلا رہا تھا۔ کیونکہ جتنی جلدی کام ختم کرتا اتنی جلدی ناشتہ اسے ملتا۔ آدمی کی سمجھ ہی کا پھیر ہے۔ دھیان تو چٹنی اور روٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کام جیسا چاہیے کس طرح ہوتا۔ اچاٹ دل سے ہاتھ بھی بہکنے لگا۔ اور ٹانکوں کے بدلے شلنگے لگنے لگے۔

مکھیوں کو مٹھاس سے عشق ہے۔ چٹنی کی میٹھی میٹھی خوشبو جو دکان میں پھیلی۔ تو ان کے غول کے غول آ گئے اور چٹنی لگی ہوئی روٹی پر بھنبھناتے بھنبھناتے چھتّا سا لگ گیا۔

درزی صاحب کی جو نظر پڑی تو ایک دفعہ ہی چلّائے۔ کمبخت تمہارا ستیاناس ہو۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ تمہیں کس نے بلایا تھا۔ کیا اپنے باوا کا دسترخوان سمجھ کر آ بیٹھیں۔ چلو ہوا کھاؤ۔

زبان سے یہ کہتے ہوئے بونے درزی نے ہاتھ کے اشارے سے

مکھیوں کو اڑا دیا۔ لیکن وہ کسی کے جھلانے کو کیا سمجھتیں۔ ہاتھ ہلانے سے اڑ گئیں اور ایک سیکنڈ نہیں گزرا تھا کہ آ بیٹھیں۔ بلکہ اوروں کو بھی بلا لائیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ تھالی پھینکو تو سر پر جائے اتنی مکھیاں تھیں کہ اگر یہ روٹی پر سوئی گڑونا چاہتا تو پہلے دو چار مکھیاں چھدتیں۔

دو چار مرتبہ اڑانے کے بعد جب مکھیاں بھنبھنانے اور روٹی پر بیٹھنے سے باز نہ آئیں تو بونے درزی نے جھاڑن اٹھایا اور یہ فرماتے ہوئے "جاتی کہاں ہو۔ بہت ستایا ہے۔ لو" مکھیوں پر مارا۔ اب جو جھاڑن ہٹاتا ہے۔ تو کچھ مکھیاں مرگئی تھیں۔ بونے صاحب ہنسے اور مقتول مکھیوں کو گنا۔ سات لاشیں پائیں جو پیٹھ کے بل پاؤں اوپر اٹھائے پڑی تھیں۔ اکڑ گئے اور اپنی پیٹھ اپنے ہاتھ سے ٹھونک کر کہنے لگے "میں بھی کتنا بہادر ہوں۔ ایک ہاتھ میں سات کو لٹا دیا۔ اب سارے شہر میں میری اس دلیری کی خبر ہونی چاہیے۔ لوگ بھی تو جانیں کہ ان کی بستی میں ایک ایسا طاقتور اور جیدار شخص ہے۔"

چنانچہ اس نے ایک کپڑا لے کر پیٹی بنائی۔ اس پر بخیہ کیا اور موٹے حرفوں میں اس پر لکھا "ایک ہاتھ میں سات" خوشی کے مارے جس طرح بھیڑ کے بچے کی دُم ہلتی ہے۔ اس کا دل اچھل رہا تھا اور ساتھ ساتھ کہتا جاتا۔ کہ "میں نے یہ کیا کہا کہ شہر والوں کو خبر کرنی چاہیے۔ اس بہادری کا تذکرہ تو تمام دنیا میں ہوگا۔ اور سب مجھے دیکھیں گے۔"

کیسا ناشتہ، روٹی اور چٹنی کو بونے درزی نے وہیں چھوڑا پیٹی کمر سے کسی، جھٹ پٹ دکان بند کر کے پہلے تو شہر میں ایک گشت لگایا اور پھر سفر کا پکا ارادہ کر گھر پہنچا تاکہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک

اپنی ناموری اور بہادری دکھائے۔ اس نے خیال کیا اس چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر اور ایک شہر میں رہ کر مجھ جیسا بہادر آدمی شہرت حاصل نہیں کر سکتا۔

جب وہ اپنے گھر سے چلنے لگا۔ تو اس نے چاروں طرف دیکھا کہ اپنے ساتھ کیا کیا چیز لینی ہے جو سفر میں کام آئے۔ اسے کوئی چیز نظر نہ آئی بسوا ایک باسی پنیر کے ٹکڑے کے۔ اس نے وہی اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ باہر نکلا تو ایک پرندہ دروازہ پر بیٹھا دکھائی دیا۔ ہاتھ مارا تو وہ مٹھی میں آگیا۔ اسے بھی پنیر کے ساتھ تھیلے کے حوالہ کیا۔

سامان جہاں گردی سے لیس ہو۔ بونے میاں ہنسنے اچھلتے کودتے چل کھڑے ہوئے۔ ہلکے پھلکے تھے۔ ایک تھیلا اور اپنی جان۔ تھکن کا کیا کام تھا۔ چلتے چلتے راستے میں شہر سے دور ایک پہاڑی پڑتی تھی۔ اس پر چڑھ گئے پہاڑ کی چوٹی پر ایک بڑا زبردست دیو بیٹھا نظر آیا جو چاروں طرف جنگل میں اپنے شکار کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا۔

دیو اتنا بڑا تھا کہ ان ننھے سے درزی صاحب کا ایک نوالہ کر جاتا۔ یہ اس کے مقابلے میں ایسے تھے جیسے چیونٹی یا جھنگا۔ اگر وہ ان پر اپنا درخت کے تنے برابر ہاتھ بھی رکھ دیتا تو مکھی کی طرح حضرت پس کر رہ جاتے۔ ہڈیاں پسلیاں سرمہ ہو جاتیں۔ لیکن درزی صاحب سوئی سے زیادہ تیز تھے۔ یہ کیا ہچکچاتے سیدھے اس کے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔

درزی: دوست، سلام! بیٹھے خالی ہاتھ پر ہاتھ رکھے کیا کر رہے

ہو۔ اس طرح سست اور بیکار رہنا اچھا نہیں۔ تم تو صرف دنیا کو جھانک جھانک کر خوش ہوتے ہو اور میں چل پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ کہو کیا ارادہ ہے؟

دیو نے بڑی حقارت سے بونے درزی کو سر سے پانوٴ تک دیکھا اور بولا۔

دیو: تم آدمی ہو یا آدمی کا خاکہ۔ یہ ذرا ذرا سے ہاتھ پانوٴ اور زبان میں یہ زور!

درزی: واللہ یہ مذاق خوب رہا۔ ماشاءاللہ (اور درزی نے اپنے کوٹ کے بٹن کھول کر اپنی پیٹی سامنے کی) ادھر دیکھو اس پر کیا لکھا ہے۔ پڑھو۔ پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میرے ظاہری ہاتھ پانوٴ۔ ڈیل ڈول پر نہ جاؤ۔

دیو نے پیٹی پر لکھا ہوا پڑھا کہ "ایک ہاتھ میں سات" سمجھا کہ اس نے ایک وار میں سات آدمی قتل کیے ہیں۔ اور سوچ میں پڑ گیا کہ میں نے کچھ اور خیال کیا تھا یہ اور نکلا۔ لیکن دل میں کہنے لگا۔ کہیں یہ رعب تو نہیں گانٹھتا۔ ذرا اسے جانچوں تو اس کی طاقت کا امتحان کرنا چاہیے۔

دیو نے یہ سوچ کر ایک پتھر اٹھایا اور مٹھی میں ایسا دبایا کہ اس میں سے پانی کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ پھر بونے درزی سے مخاطب ہوا۔

دیو: آؤ میدان میں اگر کچھ طاقت ہے اور چاہتے ہو کہ میں تم کو قوت والا سمجھوں تو جیسا میں نے کیا ہے تم بھی کر کے دکھاؤ۔

درزی: بس اسی کو تم طاقت کہتے ہو۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا

کھیل ہے اور اس نے جھکی دے کر اپنے تھیلے میں سے پنیر کا ٹکڑا نکالا۔ اور مٹھی میں بھینچا یہاں تک کہ اس میں سے چکنائی کے قطرے نکل پڑے۔

درزی: دیکھا۔ اور تمہارے نچوڑے سے میرا نچوڑ کہیں بہتر اور قیمتی ہے۔

دیو حیران تھا کہ کیا کہے۔ اس کی سٹی گم تھی۔ اس کے خیال میں بھی نہ ہوگا کہ یہ اتنا سا آدمی پتھر میں سے پانی نکال سکتا ہے۔
اب دیو نے دوسری طرح بونے درزی کو آزمانا چاہا۔ اس نے ایک پتھر لے کر اتنا اونچا پھینکا۔ کہ انسانی نگاہ مشکل سے اس کا پیچھا کر سکتی۔

دیو: میاں بالشتیے اب کہیے آپ بھی اتنا اونچا پتھر پھینک کر دکھائیں تو جانوں۔

درزی: خوب پھینکا۔ خاصی مشق ہے۔ لیکن تمہارا یہ پتھر بہر حال زمین پر گرے گا۔ یہاں نہیں دور آگے۔ ایک منٹ میں نہیں پانچ منٹ میں میرا پھینکا ہوا پتھر تو زمین کو چھوتا ہی نہیں۔ میں پھینکوں گا۔ تو وہ برابر اوپر ہی کو چلا جائے گا۔ اور اس نے پھر دیو کی آنکھ بچا اپنے تھیلے میں سے پرندے کو نکالا اور ہاتھ پھرا کر اس کو ہوا میں اڑا دیا۔ پرندہ قید سے چھوٹا تھا۔ آسمان کی طرف بلند ہوتا چلا گیا اور ایسا نظروں سے غائب ہوا کہ پھر پلٹ کر جھلک بھی نہ دکھائی۔
آپ کو شاید یہ علم نہیں کہ دیوؤں کی نگاہ کمزور ہوتی ہے کہنے والے یہی لکھ گئے ہیں۔ وہ پتھر اور پنیر یا پرندے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ

یہ دیو بھی آنکھوں کا مریض تھا۔ پنیر اور پرندے کو پتھر ہی سمجھا۔

درزی: کہیے دوست۔ کیا دیکھا کیا سمجھے ؟ میری قوت کے قائل ہوئے یا ابھی نہیں۔

دیو: یار تم ٹُنیاں معلوم ہوتا ہے۔ ہاتھ کے چالاک ہو۔ پتھر کے کرتب تمہیں خوب آتے ہیں۔ لیکن اب ذرا تھوڑا سا بوجھ اٹھا کر دکھاؤ۔ دیکھیں کتنی ہمت ہے۔ کتنا بوجھ اٹھا سکتے ہو۔

درزی: (قہقہہ لگا کر) واہ کیا کہنا۔ مجھے کوئی لدّو سمجھا ہے۔ مگر خیر تم بھی کیا یاد کروگے، بولو کیا اکھاڑ کر دکھاؤں ؟

دیو شیخی باز چالاک بونے درزی کو ساتھ لیے ایک بڑے درخت کے پاس پہنچا جو آندھی کے جھکڑ میں جڑ سے اکھڑ کر گر پڑا تھا اور بولا۔

دیو: آؤ کچھ دم ہے تو ایک طرف سے اس کو تم اٹھاؤ اور ایک طرف سے میں اٹھاؤں اور جنگل کے باہر لے چلیں۔

درزی: (چٹکی بجا کر) اس میں کیا ہاتھی گھوڑے لگتے ہیں۔ ابھی لو۔ تم اس کا تنا اپنی پیٹھ پر لاد لو میں اس کی چوٹی اور شاخیں سنبھال لوں گا۔ اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ تنے سے زیادہ شاخوں میں وزن ہوتا ہے۔

دیو احمق بونے درزی کے داؤ میں آگیا۔ درخت کا تنا اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ بونے صاحب بڑے آرام سے اس کی شاخوں پر ہو بیٹھے۔ دیو کو کیا خبر کہ اس کی پیٹھ کے پیچھے کیا ہو رہا ہے وہ سارے درخت کو بلکہ بونے درزی کو بھی اٹھا کر لے چلا۔ بونے میاں مزے سے سواری گانٹھے ہوئے تھے۔ خوشی میں آکر انھوں نے گانا شروع کیا۔ کوئی بات ہی نہیں اور اتنے بڑے درخت کا اٹھانا کھیل ہے۔

درزی (اپنے دل میں ہنس کر) واہ رے میں نے دیو کو کیا بے وقوف بنایا ہے۔ ایسا بھی تماشا کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں۔

دیو تو تھوڑی دیر درخت کو کھینچتا رہا۔ آخر اس کا سانس پھول گیا۔ کمر دکھ گئی۔ اتنا بوجھ لیے ہوئے آگے چلنے کی ہمت نہ ہوئی اور چلانے لگا "باپ رے۔ کتنا بوجھ ہے۔ یار اب میں اس درخت کو پھینکتا ہوں زیادہ نہیں چلا جاتا۔

لونے درزی نے جلدی سے کود دونوں ہاتھوں سے درخت کی شاخوں کو پکڑ لیا۔ جیسے کوئی سمجھے کہ وہ راستے بھر اسے سنبھالے لا رہا تھا۔ اور دیو سے کہا "تم نے تو دیو کا نام ڈبو دیا۔ یہ ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول دیکھنے ہی کے ہیں۔ ایک ذرا سا درخت نہیں چل سکتا۔ بھینسے کی طرح ہانپنے لگے، پھینکتے ہو تو پھینک دو۔

دیو نے درخت پھینک دیا اور شرمندہ سا ہو کر آگے بڑھا۔ دونوں چلے جا رہے تھے کہ کسی پھل دار درخت کے پاس سے گزرے۔ درخت کے اوپر والے حصے میں پکے پکے پھل دیکھ کر دیو کھڑا ہو گیا۔

دیو: کیسے اچھے پھل ہیں کھاؤ گے؟

درزی: کیوں نہیں بھوک لگی ہوئی ہے۔

دیو نے سب سے اونچی شاخوں کو پکڑ کر نیچے جھکایا اور دو ایک شاخیں درزی کے ہاتھ میں دے دیں۔ لو توڑو اور کھاؤ۔

درزی بچارے میں اتنا دم کہاں تھا کہ شاخیں اس کے ہاتھ میں جھکی رہتیں۔ دیو کے چھوڑتے ہی شاخیں جو اٹھیں تو بونے صاحب کو بھی اپنے

ساتھ لے گئیں۔ درزی میاں ٹنگ گئے۔ پلک جھپکنے کا کام تھا اوپر جاکر حضرت ٹنگے بھی نہ رہ سکے۔ دھڑ ست نیچے آپڑے خیر یہ ہوئی کہ کہیں چوٹ نہیں آئی۔

دیو: یہ کیا؟ تم میں اتنی بھی سکت نہیں کہ ایک ٹہنی کو پکڑے رہتے اس برتے پر میری برابری کا دعوا ہے۔

درزی: کیا تمھارا مطلب ہے کہ میں اس ننھی سی ٹہنی پر زور آزمائی کرتا؟ جو شخص ایک ہاتھ میں سات کو لٹا دے اس کے لیے یہ بھی کوئی آزمایش ہے۔ ہو نہ آخر گدھے۔ میں تو جان کر درخت پر سے کودا ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ وہ دیکھو سامنے شکاری بندوق چھپائے کھڑے ہیں۔ شاخوں ہی پر نشانہ لگائیں گے۔ مگر تمھاری ایسی آنکھیں کہاں جو سوجھے۔ اچھا تم اس طرح چھلانگ لگا کر دکھاؤ۔

دیو اپنی پوری طاقت سے اُچھلا لیکن درخت کو نہ پھلانگ سکا۔ اور شاخوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اس طرح اس معاملہ میں بھی بازی بونے درزی کے ہاتھ رہی اور دیو بھسڈّی رہا۔

درزی: دوست جھینپو نہیں۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ تم کو تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یاد رکھو چھوٹی کھونٹی کے آدمی بلا کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ آیندہ کبھی ان سے اڑو تو دیکھ کر اڑنا۔

دیو: واقعی! کچھ بھی سہی۔ مگر یار تم بے شک نرالی قسم کے آدمی ہو جی چاہتا ہے تمھارا بایاں پیر چوم لوں۔

درزی: (مسکرا کر) اچھا تم میری طاقت کے قائل ہوئے یا نہیں۔

دیو: قائل کیا میں آج سے تمھارا چیلا ہوں۔

درزی: پھر میرے ساتھ چلوگے نا۔

دیو: ضرور، لیکن اب اندھیرا ہو چلا ہے۔ رات کو ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرماؤ۔ کھانا بھی کھانا آرام بھی کرنا۔ صبح کو جہاں جاؤ گے یہ غلام ساتھ ہے۔

درزی: یار۔ بات تو میرے دل کی سی کہی چلو تمھارا گھر کہاں ہے؟

دیو: قریب ہی ایک غار میں ہم رہتے ہیں۔

بوتے درزی صاحب نہایت خوش خوش اپنے یار دیو کے ساتھ اس کے گھر چلے۔ پہاڑ کے ایک بڑے غار میں دیو کا گھر تھا۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ آگ کا الاؤ لگا ہوا ہے۔ چھے دیو اور اس کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں بھنی ہوئی مسلم بھیڑ ہے اور اسے بھنبھوڑ رہے ہیں۔

درزی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دل میں سوچا "پھنسے تو بڑے ہیں مگر کیا ڈر ہے، ان کے جسم میرے دماغ کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں دکان پر بیٹھے بیٹھے سات کو مار لیا تو یہاں تو بڑا میدان ہے۔

دیو نے پہلے تو کھانے کی تواضع کی پھر ایک بستر دکھا کر کہا کہ دوست اب تم اس پر لیٹ کر سو جاؤ۔ اچھی طرح پاؤں پھیلا کر سونا۔ بستر دیو کا تھا اور درزی صاحب ننھے سے بودنے جہانے کے جہاز پر کیا لیٹتے۔ دیوؤں کی نظر بچا کر ایک کونے میں جا بیٹھے اور بستر کو یونہی خالی رہنے دیا۔ بستر کے بڑے ہونے کے علاوہ بوتے میاں کو اپنی جان کی حفاظت بھی ضروری تھی اتنے دیوؤں میں ایک بھنگے کی کیا بساط۔ سویا اور مرا برابر ہوتا ہے۔ وہ غافل دیکھ کر ڈاڑھ بھی نہ لگائیں اور نگل جائیں۔

آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر ہوئی تو دیو یہ سمجھ کر کہ بونا درزی بے خبر سو گیا ہو گا اُٹھا۔ اپنا لوہے کا موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لیا اور دبے پاؤں پلنگ کے پاس آکر ایسے زور سے مارا کہ چارپائی کے پرخچے اڑ گئے دل میں کہا کہ "پاپ کٹا۔ بلا سے پیچھا چھٹا۔ کمبخت بھتنا بن کر لپٹ گیا تھا۔ چلو خاتمہ ہوا۔ کہیں پٹی سے یا بچھونے میں لاش چپک کر رہ گئی ہو گی۔

لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ بونے میاں امن کے ساتھ ایک کونے سے لگے مزے میں زندہ و سلامت بیٹھے ہوئے تھے وہ چارپائی پر کہاں تھے جو اُن کا بال تک بیکا ہوتا۔

صبح بہت سویرے، ابھی تارے چھٹکے ہوئے تھے کہ دیو شکار کی گھات میں جنگل کو چل دیے۔ بونا درزی انھیں یاد بھی نہیں آیا۔ اسے بالکل ہی بھول گئے۔ انھیں اس کا خیال بھی نہ تھا کہ یکایک جو نظر اٹھی تو حضرت سلامت ٹہلتے چلے آرہے ہیں نہایت خوش و خرم ہنستے گاتے۔ دیکھتے ہی دیووں کی پھونک سرک گئی۔ ہوش جاتے رہے۔ بونے کی صورت ہوا معلوم ہونے لگی۔ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ ہمیں مار ڈالے اور اس کے سامنے سے سر پر پاؤں رکھ کر ایسے بھاگے کہ پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔

درزی: (زور سے قہقہہ لگا کر) قاہ، قاہ، قاہ! دوست جاتے کہاں ہو۔ ٹھہرو تو۔ بات تو سنتے جاؤ۔ میں تمھیں کھا نہیں جاؤں گا۔ میرا جسم زیادہ بڑا نہیں ہے۔ یقیناً میں چھوٹا سا آدمی ہوں لیکن میرے دماغ میں بڑی طاقت ہے۔ اس کے بل پر دیکھ لو میں نے تم سب کو بھگا دیا۔ اور

آخر میدان جیت گیا۔ میاں عقل والوں کے سامنے طاقت کی ڈینگیں نہیں چلا کرتیں۔

دیوؤں کو بھگا کر یا جب دیو بھاگ گئے، تو بونے درزی اکیلے اپنی راہ چل پڑے۔ جنگل، میدان، دریا، پہاڑ ندی نالے طے کرتے کرتے بہت دنوں کے بعد ایک شہر کے آثار نظر آئے۔ شہر کے باہر بادشاہ کا محل تھا۔ گرداگرد باغ۔ باغ میں جا کر ٹھنڈک جو معلوم ہوئی تو نیند آنے لگی۔ درختوں کی چھاؤں میں ایک طرف گھاس پر دراز ہو گئے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی لیٹتے ہی ہوا نے پہلی تھپکی میں سُلا دیا۔

بونے درزی کو سوئے تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ محل کے نگہبانوں یا باغ کے مالیوں میں سے کچھ لوگ اُدھر آ نکلے۔ غیر آدمی کو پڑا دیکھ کر تعجب کرنے لگے۔ اتنے میں درزی کی پیٹی پر نگاہ پڑی۔ پڑھا تو لکھا تھا۔ "ایک ہاتھ میں سات" آپس میں کہنے لگے "یہ تو کوئی رستم و اسفندیار کا بھی چچا معلوم ہوتا ہے ہمارے امن و اماں والے ملک میں ان کی آمد کیسے ہوئی؟ ان کا یہاں آنا ضرور غیب کی تائید سے ہوا ہوگا۔"

وہ سب دوڑے بادشاہ کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ جہاں پناہ حضور کے اقبال سے ایک ایسا شخص یہاں آگیا ہے کہ اب بڑے سے بڑے دشمن کا بھی ڈر نہیں رہا۔ جنگ میں اس سے زیادہ کوئی کام کا آدمی ہو نہیں سکتا۔ ایک ہاتھ میں کسی نے بھی سات سات کو مارا ہے۔ حضور اسے نہ چھوڑیں۔ جس طرح بنے رکھیں۔

بادشاہ سلامت یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ گھر بیٹھے ایک تیس مار خاں آ گئے، اور اپنے آدمیوں میں سے ایک سے کہا کہ اس بہادر

سے کے پاس جاؤ اگر وہ جاگ اٹھا ہو تو اس سے پوچھنا کہ کیا تم ہماری فوج کی سرداری قبول کرو گے۔

آدمی پہنچا تو درزی صاحب ابھی سو رہے تھے۔ وہ کھڑا رہا اور جب انھوں نے نیند بھر کر آنکھ کھولی تو اس نے اپنے بادشاہ کا پیغام سنایا۔

(درزی بادشاہ کا پیغام سن کر) اور میری یہاں آنے سے کیا غرض ہے۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔ یہی میرا مقصد ہے۔ میں تمھارے بادشاہ کی طرف سے لڑوں گا۔ مجھے بالکل تیار سمجھو۔ ابھی کہو تو اپنے ہاتھ دکھاؤں۔

یہ سنتے ہی درزی صاحب کی خاطر مدارت شروع ہو گئی۔ بادشاہ نے اپنے محلات میں سے ایک مکان رہنے کو دیا۔ اور فوج کا ایک دستہ حوالے کیا۔ لیکن بادشاہ کے پرانے ملازموں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی کہ ایک نیا چھوٹا سا آدمی آتے ہی سردار بن جائے۔ وہ حسد کرنے لگے اور صلاحیں ہونے لگیں کہ اسے کہیں بہت دور بھجوانا چاہیے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل' نہ سامنے ہو گا نہ اس کی خاطریں ہوں گی۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ اب ہماری کیا پرسش ہو گی۔ اگر ہم کھلم کھلا اس سے لڑائی باندھتے ہیں تو یہ ٹھہرا کیس مار خاں۔ جو ایک ہاتھ میں سات سات کو لٹا دے وہ ہمیں کیا چھوڑے گا۔ چند روز میں ہم سب کا خاتمہ سمجھو۔ چنانچہ جب ان سب کی ایک صلاح ہو گئی تو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ بھلا حضور ہم ایسے شخص کے ساتھ کیا نام پیدا کر سکتے ہیں جو ایک ایک وار میں سات سات کو مار ڈالے۔ ہماری ساری عمر کی کمائی غارت ہوئی جاتی ہے۔ یا تو یہ رہے گا یا ہم۔ بادشاہ سوچ میں پڑ گیا وہ نہیں چاہتا

تھا کہ ایک آدمی کی وجہ سے خواہ وہ کیسا ہی سورما سہی اتنے پرانے اور خیرخواہ ملازموں کو گنوا دے اس نے انھیں تو کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن دل میں ارادہ کرلیا۔ کہ جس طرح بنے اس سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔ پچھتانے لگا کہ میں نے اتنی جلدی کیوں کی اسے منظورِ نظر بنانا ہی نہ تھا۔ اچھا اب کیا تدبیر کرے جو سانپ مرجائے اور لاٹھی ٹوٹے نہیں۔ اسے یہ بھی جرات نہ تھی کہ اسے فوراً نکال دیتا۔ وہ ڈرتا تھا کہ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی کہیں مار ڈالا تو اس کا کون پوچھنے والا ہے اور پھر اگر میری جگہ بادشاہ بن بیٹھا تو۔؟

وہ دیر تک بڑے گہرے غور کے ساتھ اس معاملہ کو سوچتا رہا اور آخر اپنے دماغ میں فیصلہ کرلیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اپنا منصوبہ گانٹھ کر اس نے درزی کو بلوایا اور نہایت تپاک سے اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

بادشاہ: تمھاری شہزوری، بہادری اور جنگ جوئی کی بہت تعریفیں سُنی ہیں۔ صورت بھی بتا رہی ہے کہ تم اپنے وقت کے رستم ہو۔

درزی: جی ہاں، ایک ہاتھ میں سات سات کو فنا کے گھاٹ اتار دینا میرے لیے معمولی بات ہے۔

بادشاہ: اسی لیے میں نے تم کو اپنے لشکر کا سردار بنایا ہے اور اب میں ایک خدمت تمھارے سپرد کرنے والا ہوں۔

درزی: کہیے میں حاضر ہوں۔

بادشاہ: میرے ممالک محروسہ کے ایک جنگل میں دو دیو کہیں سے آگئے ہیں۔ انھوں نے ادھم مچا رکھی ہے لوٹتے ہیں مار ڈالتے ہیں کھا جاتے ہیں۔ ہر چیز میں آگ لگا دیتے ہیں۔ بیسیوں گاؤں اجاڑ دیے۔ آبادیاں ویران ہوگئیں۔ ادھر سے کوئی گزر نہیں سکتا۔ راستہ بند ہوگیا ہے بھولے چوکے

کوئی نکل جائے تو اس کی خیر نہیں رہتی۔

درزی: آج تک انھیں کوئی نہیں مار سکا؟

بادشاہ: کون مارے کس میں اتنی جرأت ہے۔

درزی: دیوؤں کا مارنا کون مشکل ہے۔ میں نے تو ایک ایک ہاتھ میں سات سات مار ڈالے ہیں۔

بادشاہ: اگر تم نے ان دونوں دیوؤں کو مار ڈالا تو میں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ تمھاری شادی کر دوں گا۔ اور میری آدھی بادشاہت کے بھی تم مالک ہوگے۔

درزی: آپ نے بڑی فکر کی۔ انھیں ابھی سے مرا سمجھو۔

بادشاہ: سو نہایت منچلے سوار بھی میں تمھاری مدد کے لیے دوں گا۔

درزی: آپ کی خوشی مگر مجھے مدد کی ضرورت نہیں میں اکیلا ہی اُن دو کے لیے بہت ہوں۔

بونے صاحب دل میں کہنے لگے کہ مجھ جیسے ایک آدمی کے لیے اور کیا چاہیے؟ یہ تقدیر والوں کی باتیں ہیں۔ نہ بھورے ہیں۔ چپڑی اور دو دو کس کی طاقت ہے کسی کا ایسا نصیب کہ شہزادی کو بھی لے اور آدھی بادشاہت بھی۔ روز روز کہیں مقدر کے دروازے اسس طرح کھلا کرتے ہیں۔

بادشاہ: پھر کیا ارادہ ہے۔

درزی: ارادہ کیا ہوگا، آپ نے کیا مجھے کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے بس ہو گئی جو بات پکی۔ یہی نا کہ ان دونوں دیوؤں کا خاتمہ کر دوں۔ کر دوں گا۔ مجھے آپ کے سو سواروں کی بھی ضرورت نہیں۔ جس کے ایک پٹخے میں سات

بتراکٹ جائیں وہ دو سے کیا ڈرے گا۔ انھیں اپنے پاس رہنے دیں تو اچھا ہے۔

بادشاہ کو یقین تھا کہ دیو ضرور اس بونے کو کھا جائیں گے۔ اس لیے بطور گواہ کے اس نے سواروں کا بھیجنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسرے دن بونے درزی صاحب اپنی مہم پر چل کھڑے ہوئے۔ سو سواروں کا رسالہ رگدبگد کرتا ہوا پیچھے پیچھے ان کے ساتھ تھا۔

چلتے چلتے جب وہ اس جنگل کے سرے پر پہنچے جہاں دیوؤں کا مسکن تھا تو بونے میاں نے سواروں کو حکم دیا کہ "تم یہیں ٹھہرو اور میرا انتظار کرو میں اکیلا دونوں دیوؤں کو مار دوں گا۔" سوار ٹھہر گئے اور بونے صاحب بَن میں داخل ہوئے۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں سے اپنے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دور چل کر دیکھا کہ دونوں دیو ایک بڑے درخت کے نیچے پڑے سوتے ہیں۔ ان کے خراٹوں کی آواز اور سانسوں کی ہوا سے درخت کی شاخوں میں بھونچال سا آیا ہوا ہے۔

دیو بہت بڑے اور نہایت ڈراونی شکلوں کے تھے ان کے چہروں سے ایسا خوف معلوم ہوتا تھا کہ بونے میاں اپنے دل ہی دل میں کہنے لگے کہ بھلے کو دونوں بے خبر سوتے ہیں اور مجھے ان کے مارنے میں اپنے دماغ لڑانے کا موقع مل گیا۔ اگر جاگتے ہوتے تو ذرا دقت ہوتی۔ اچھا مجھ سے بچ کر کہاں جاتے ہیں۔ دیکھو کس ترکیب سے ان کا علاج کرتا ہوں۔

بونے درزی نے پہلے تو اپنا سر کھجایا۔ اپنی تھوڑی کھرچی۔ پھر جلدی جلدی پتھروں سے تھیلا بھر جس درخت کے نیچے وہ سوتے تھے۔ جھٹ اس پر چڑھ گیا اور بندر کی طرح اس گدے سے اس گدے پر

اُس گدّے سے اِس پر چڑھتے اترتے ٹھیک دونوں دیوؤں کے اوپر پھیلی ہوئی شاخوں میں دبک کر بیٹھ گیا۔ جب اچھی طرح پاؤں جما لیے تو پتھر نکال ایسے تاک تاک کر پہلے ایک دیو کے منھ پر مارنے شروع کیے کہ جو پڑتا اس کی ناک پر۔

دیر تک تو دیو کو کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔ کنکروں کا دیو پر کیا اثر ہوتا۔ لیکن پتھر جو اس کے نتھنے میں گھسا تو اس کی آنکھ کھل گئی اور دوسرے دیو سے کہنے لگا "ارے یہ کیا دل لگی ہے۔ پتھر میری ناک میں کیوں گھسیڑ رہا ہے؟"

دوسرا دیو۔ میں ایسی دل لگی کرنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں کیوں تیری ناک میں پتھر گھسیڑنے لگا۔ خواب دیکھا ہوگا۔

دو چار منٹ جھک جھک کر کے پھر دونوں سو گئے اور خرّاٹے لینے لگے اب بونے درزی نے دوسرے دیو پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ اور ایک ذرا بڑا سا پتھر ایسا نشانہ باندھ کر پھینکا کہ اس کی آنکھ پر پڑا دیو گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا "اس شرارت کے کیا معنی؟ تو نے مجھے پتھر کیوں مارا۔ ابھی جو میری آنکھ پھوٹ جاتی۔

دوسرا دیو (چلّا کر) کچھ پاگل تو نہیں ہو گیا۔ تیرے برابر تو پڑا سو رہا ہوں۔ یہ خوب رہی۔ میرا کیا دماغ چل گیا ہے جو پتھر ماروں گا۔

اس مرتبہ اور ذرا دیر تک تُو تُو میں میں ہوتی رہی جب دونوں جھگڑتے جھگڑتے تھک گئے تو دونوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ بونے درزی چُپ چاپ شاخوں سے چپکے ہوئے سب دیکھ رہے تھے۔ جب دیوؤں نے آنکھیں بند کرلیں اور ان کے خرّاٹوں کی آواز آنے لگی۔ تو اس نے

ایک دفعہ پھر چاند ماری شروع کر دی۔ اور دو چار چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکنے کے بعد سب سے بڑا ایک پتھر نکالا۔ ایک دیو کا منہ کھلا ہوا تھا۔ خدا کا نام لے کر جو مارتے ہیں تو سیدھا اس کے منہ میں جا کر حلق کا دربان بن گیا۔

دیو بھینسے کی طرح چلایا کہ ٹھہر تو بدمعاش تیری تو ہنسی ٹھہری اور میری جان چلی۔ اب میں تجھے اس کا مزہ چکھا کر رہوں گا۔ اور غصہ میں دیوانہ ہو کر اس نے پوری طاقت سے اپنے ساتھی کو ایک درخت پر پٹخ دیا۔ دوسرے کو بھی تاؤ آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے پر چھلا چھلا کر حملے کرنے لگے۔ درخت اکھاڑ اکھاڑ کر ایک نے دوسرے پر دے دے مارے۔ کوئی دس منٹ تک جنگ کا میدان گرم رہا۔ اور دونوں یہاں تک لڑے کہ سوکھے ہوئے درختوں کی طرح گر پڑے اور مر گئے۔

بونے درزی نے دونوں دیوؤں کو دم توڑتے دیکھ لیا تو درخت سے کود کر نیچے آئے اور فرمانے لگے دیکھا میری دماغی قوت کا کرشمہ! ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ کیسا چوکھا آیا۔ مگر خیر یہ ہوئی کہ انھوں نے لڑائی میں اس درخت کو نہ اکھاڑا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اگر کہیں وہ اسے اکھاڑ لیتے تو کسی نہ کسی کے سر پر مجھے ضرور کودنا پڑتا اور ذرا کام بھاری ہو جاتا۔

اس کے بعد خلیفہ جی نے تلوار کھینچ ماتا، اللہ پانچوں ہتھیار لگا کر آئے تھے۔ دونوں دیوؤں کے مردوں پہ خوب ہاتھوں کی صفائی دکھائی اور انھیں زخمی بنا جنگل سے باہر نکل سواروں کے پاس آئے۔

درزی: (زور سے پکار کر تا کہ سب سوار سن لیں) کام ہو گیا۔ دونوں

دیوؤں کی بل سے لاشیں ڈال دیں۔ واقعی بڑے جگادری دیو تھے۔ اُن پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ بڑی واویلا مچائی۔ درخت اکھیڑ کر مجھ پر پلے لیکن میرے ساتھ کہیں ان کی کاری گری چل سکتی تھی۔ جو ایک وار میں سات سات کو مار مار کر رکھ دے اس سے۔ کیا بر سرِ آتے میری للکار تو تم نے سُنی ہو گی۔ پیترے بدل بدل کر جو مارا ہے تو ڈھیر کر دیا۔

سوار: آپ کو تو کوئی چوٹ نہیں آئی۔

درزی: (مسکرا کر) میرے، توبہ کرو! میں انھیں اپنے قریب آنے نہ دیتا تھا۔ میرا رونگٹا بھی وہ میلا نہ کر سکے۔

سواروں کو یقین نہ آیا اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

درزی: بھائی تمھارا سوچنا غلط نہیں۔ تم نے ایسا تماشا کب دیکھا ہو گا۔ مجھ جیسا بہادر کہانیوں کے سوا کہاں ہوتا ہے۔ آؤ۔ ڈرو نہیں۔ مُردوں سے کیا ڈرنا ہیں تمھیں دکھاؤں۔

سوار بَن کے اندر گئے تو دیکھا کہ سچ مچ دیو خون میں لت پت مُردہ پڑے ہیں اور چاروں طرف درختوں کا سَتھراو ہے۔

یہاں سے فرصت پا کر لوٹے درزی صاحب بادشاہ سلامت کے پاس پہنچ کر لائیے۔ میں نے اپنا کام کر دیا۔ اب اپنی شرط پوری کیجیے۔ آدھی بادشاہت دیجیے اور بیٹی بیاہیے۔

بادشاہ کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ پریشان ہو گیا اور دوسری تدبیر سوچنے لگا کہ یہ بلا دور ہو۔ کسی طرح سے قتل کر دیا جائے۔

بادشاہ: واہ بھئی واہ، تم جیسا بہادر اور ایسا بے صبرا میری بیٹی بھی موجود

ہے اور آدھی سلطنت بھی۔ مگر ایک کام تمہیں اور کرنا ہوگا۔

درزی: (تن کر) وہ بھی کہہ ڈالیے۔

بادشاہ: ایک ارنا گھوڑا نہ جانے کہاں سے ہمارے جنگل میں آچھپا ہے ایسا ظالم دیکھا ہے نہ سُنا۔ سارے کھیتوں کے کھلیان کر دیے ہیں۔ اس کے ماتھے پر ایک سینگ ہے نہایت خوفناک۔ نہ آدمی اس سے بچتے ہیں نہ مویشی، ذرا اِسے تو پکڑ لاؤ۔

درزی: جب میں دیووُں سے نہیں ڈرا تو ایک ارنے گھوڑے سے کیا ڈروں گا۔ ایک سینگ کیا دس سینگ بھی اس کے ہوں تو مجھے پروا نہیں۔ ایک ہاتھ میں سات، یہ میرا مقولہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ابھی جاتا ہوں اور اسے پکڑ لاتا ہوں۔

بادشاہ: پہلے کی طرح سو سوار اب بھی تمھارے ساتھ جائیں گے۔

درزی: بیکار۔ نہ دیووُں کے مارنے میں اُن سے میں نے کچھ مدد لی نہ اس گھوڑے کے پکڑنے میں ان کی مجھے ضرورت ہے۔

بادشاہ: داشتہ آید بکار۔ یہ جانور ہے اور وحشی شاید اس کے گھیرنے میں ضرورت ہو۔

درزی: آپ مجھے سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر آپ کی خوشی۔

بونے درزی نے ایک رسّی اور ایک کلھاڑی اپنے ساتھ لی اور جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ بَن پہنچ کر پھر وہی کیا جو دیووُں کی مہم پر کیا تھا۔ سواروں کو باہر ہی چھوڑا۔ ان سے کہہ دیا کہ تمھارا اندر جانا کچھ ضروری نہیں تم یہیں میرے واپس آنے کا انتظار کرو۔

جنگل گھنا تھا۔ مگر ارنا گھوڑے کی تلاش میں زیادہ وقت نہیں اٹھانی

پڑی۔ بہت سے بہت کوئی چار پانچ سو قدم طے کیے تھے کہ گھوڑا اپنی آنکھیں چمکاتا اور نتھنے پھُلاتا، ہنہناتا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

ادھر بونے میاں کی نظر اس پر پڑی اور اِدھر گھوڑے نے ان کو دیکھا۔ ایک تو وحشی جانور۔ دوسرے اس کی سینگ کو آدمی کا خون لگا ہوا پھر حضرت کی دمنع بھی نرالی۔ وہ انھیں دیکھتے ہی لپکا۔ اور لپکا بھی ایسا جھپٹ کر گویا ابھی چھید کر رکھ دے گا اور میاں بونے جہاں کے تہاں زمین سے چپکے کے چپکے رہ جائیں گے۔ لیکن جناب قبلہ درزی صاحب کی دور بلا یہ جتنے زمین کے اوپر تھے اتنے ہی زمین کے نیچے۔ پھر حواس تو آدمی میں ایک چیز ہیں۔ آپ گھوڑے سے آنکھیں لڑاتے ہوئے کہنے لگے "دوست! جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ اتنی تیزی نہ دکھاؤ۔ مجھ سے مقابلہ کا ارادہ ہے تو ذرا سنبھل کر۔ قدم، قدم، قدم، قدم"! اور جہاں تھے وہاں بیزا جائے بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے اس انتظار میں کہ گھوڑا قریب آجائے۔

گھوڑے کی رفتار آندھی تھی۔ پلک جھپکتے وہ سامنے آگیا۔ اس کا سامنے آنا تھا کہ جناب دو قدم پیچھے ہٹ جھٹ ایک بڑے درخت کی اوٹ میں ہو گئے۔ جھلّائے ہوئے خونی جنگلی جانور کی دوڑ خدا کی پناہ۔ وہ جو زور میں آیا تو درخت سے ٹکرّ ہوئی۔ یا تو درزی کو چھیدنا چاہتا تھا یا آپ الجھ کر رہ گیا درخت کے تنے میں اس کا سینگ ایسا پیوست ہوا کہ جنبش نہ کر سکا۔ جیسے کسی نے میخ ٹھونک دی۔ بہیترا تڑپا۔ دولتیاں ماریں۔ جھنجھوٹیاں لیں۔ سینگ ٹس سے مس نہ ہوا۔ گھوڑے صاحب بے باندھے بندھ گئے۔

درزی: (درخت کی اوٹ سے نکل کر) کیوں دوست دیکھا جلد بازی کا تماشا ہم نہ کہتے تھے کہ اتنا غصہ نہ کرو۔ کہو کیسے پھنسے! اپنے شانے پر تھپکی

دیتے ہوئے۔ شاباش! خوب پکڑا!!
یہ کہتے اور ہنستے بونے صاحب آگے بڑھے۔ رسی گھوڑے کی گردن میں ڈال کر خوب مضبوط درخت سے باندھ دیا۔ پھر کلہاڑی کی مدد سے اس کا پھنسا ہوا سینگ درخت میں سے نکالا۔ جب سب کام ہو گئے تو سواروں کو بلا کر کہا۔ لو یہ اپنا ارنا گھوڑا۔ میرا کام پکڑنا تھا۔ میں نے پکڑ دیا۔ اب اس کی حفاظت کے تم ذمہ دار ہو۔ لے چلو بادشاہ سلامت کے سامنے۔
بادشاہ سلامت ارنے گھوڑے کو پکڑا ہوا دیکھ کر حیران ہو گئے۔ سوچا کچھ تھا ہوا کچھ۔ لاٹھیاں ٹوٹی جاتی ہیں۔ سانپ نہیں مرتا۔ دل میں بڑے جز بز کہ عجب انسان سے پالا پڑا ہے۔ کسی طرح ان کی مرضی نہ تھی کہ اس جناتی قسم کے آدمی کو جس کا حسب معلوم ہے نہ نسب۔ جس کی نہ صورت ہے نہ شکل۔ اپنی اکلوتی بیٹی دیں۔ ساتھ ہی صاف انکار کرتے بھی بن نہیں پڑتی تھی۔ خوف تھا کہ پلٹ پڑا تو قیامت آجائے گی۔
سوچتے سوچتے تیسرا کام نکالا اور بولے کہ ایک مصیبت اور ہم پر نازل ہو گئی ہے لگے ہاتھوں اسے بھی ٹال دو۔ کچھ دن سے ہمارے جنگلات میں ایک جنگلی سور آگیا ہے۔ اس نے رعایا کے جان و مال کو بہت نقصان پہنچائے ہیں۔ اسے پکڑ لاؤ تو پھر کسی بات کا غم نہیں رہے گا۔ میرے شکاری تمہارے ساتھ رہیں گے جس طرح تم چاہنا ان سے کام لینا۔
درزی: گینڈا نہیں۔ ہاتھی نہیں۔ جنگلی سور! اس کا پکڑنا ہی کیا ایسے ایسے کھیل تو میرے محلّے کے بچّے کھیلا کرتے ہیں۔ کل صبح ہی لو۔
ابھی دن پورا نکلا بھی نہ تھا کہ بہادر درزی سور پکڑنے جنگل میں جا دھمکے اور اپنے قاعدے کے موافق شکاریوں کو باہر ٹھہرنے کا حکم دیا۔ شکاری خدا سے

چاہتے تھے کہ سور کے سامنے نہ جائیں کیونکہ سور نے ان کے کئی آدمیوں کو بڑی بے دردی سے چیر کر رکھ دیا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ان کی جان نکلتی تھی۔ وہ بڑی خوشی کے ساتھ باہر ہی ٹھہرے رہے اور درزی صاحب کو جنگل کے اندر جانے دیا۔

جونہی بونے درزی صاحب اندر پہنچے اور سور نے انھیں دیکھا تو وہ منہ سے جھاگ اُڑاتا اور دانت چمکاتا ان پر جھپٹا۔ سور کی جھپٹ بڑے غضب کی ہوتی ہے۔ اس نے چاہا کہ درزی میاں کو دے ٹکے اور پیٹ چیر ڈالے لیکن وہ ایک کائیاں سب گھاتیں سمجھے بوجھے۔ سور کو جھپٹتا ہوا دیکھ کر بڑی تیزی سے بھاگے۔ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے سور۔ جب وہ قریب آتا یہ گھائی دے کر دوسرے رخ مڑ جاتے۔ سور ایک رخا دوڑتا ہے۔ بغیر اپنی رفتار ہلکی کیے مڑ نہیں سکتا۔ اس لیے درزی صاحب اس کی زد میں کیا آتے۔ کتراتے اور ادھر سے اُدھر ہوتے چلے جاتے تھے۔ آخر کار ایک محل کی پرانی عمارت نظر آئی اور بونے میاں لپک کر اس کے اندر گھس گئے۔ سور بھی پیچھے لگا ہوا محل میں جا گھسا۔ محل کی پشت پر ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ درزی چھوٹی انگلیٹ کے آدمی پھرتی کے ساتھ ذقند لگا کھڑکی میں سے کود باہر۔ سور انھیں دیکھتا ہی رہا اور انھوں نے چکر کاٹ جھٹ محل کا دروازہ بند کر دیا۔ لیجیے سور بھی پکڑا گیا۔ محل ان کا قید خانہ بن گیا۔ کھڑکی سامنے تھی۔ مگر اتنے بھاری جسم کو لے کر کیوں کر اچکتے اور چھلانگ مار کر نکلتے۔

مختصر یہ کہ درزی صاحب نے یہ تیسری مہم بھی سر کر لی۔ سور کو محل کے اندر بند کر دیا تو بادشاہ کے شکاریوں کو بلایا کہ اپنی آنکھوں سے شکار کو جیتا جاگتا پکڑا ہوا دیکھ لیں اور اب انھیں اختیار ہے چاہے بادشاہ کے پاس اس کو لے جائیں

چاہے یہیں مار ڈالیں۔ سوٗر کو شکاریوں کے حوالہ کر درزی صاحب تنتے اکڑتے بادشاہ کے پاس پہنچے۔ اب کیا عذر باقی رہا تھا۔ تیسرا داؤ خدائی داؤں ہوتا ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے۔ سخن مرداں جاں دارد۔ بادشاہ سلامت مجبور تھے کہ اپنا وعدہ پورا کریں۔ اپنی بیٹی بھی دیں اور آدھی سلطنت بھی ہاں اگر بادشاہ سلامت یہ جان لیتے کہ آپ خیر سے درزی ہیں اور درزی کے سوا بالکل کچھ نہیں تو باوجود ان تمام باتوں کے وہ شاید کوئی اور حجت نکالتے کسی دوسری تدبیر سے اس کا پاپ کاٹنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اس کے سوا کہ قدرت نے صرف صورت نہیں بنائی۔ ورنہ ہے کسی نامور بہادر گھرانے کا۔ زیادہ بُرا خیال نہ کیا اور بونے درزی صاحب سے اپنی چہیتی بیٹی کی شادی کر دی اور اپنا آدھا ملک بھی حوالے کرنا پڑا۔

اللہ میاں بھی تماشے کرتے رہتے ہیں۔ سوئی مارتے مارتے مکھیاں کیا ماریں کہ تقدیر پر چاند ماری کی۔ بادشاہ کی بیٹی بھی بیاہ لی۔ بادشاہ کے داماد بھی ہو گئے اور بادشاہ بھی بن بیٹھے۔ واہ کیا شان ہے۔ ایک بونا درزی اور بادشاہ

کھائیں حلوا بیچیں تیل یہ دیکھو قدرت کے کھیل

کچھ دن بعد ایک رات کو شاہی محل میں بونے درزی صاحب چھپر کھٹ پر آرام فرما رہے تھے کہ خواب میں بڑبڑانے لگے۔ ملکہ صاحبہ پاس سوتی تھیں آواز سے اُن کی آنکھ کھل گئی۔ سنا، خاوند صاحب کہہ رہے ہیں۔ ہاں بچو شاباش جلدی ہاتھ چلا۔ اس کوٹ کی آستین کو میں لگاؤں گا۔ تو ذرا پتلون کے ٹانکے اُدھیڑ ڈال۔ مگر دیکھ خبردار کپڑا کٹنے نہیں۔ ذرا ہاتھ بہکا اور میں نے چانٹا دیا ہوشیاری سے۔

شہزادی کو بڑا رنج ہوا وہ سمجھ گئی کہ شوہر صاحب درزی ہیں۔ ان کے بدشکل ہونے کا اسے اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا یہ معلوم کر کے تکلیف ہوئی کہ شہزادہ تو شہزادہ وہ امیرزادہ بھی نہیں۔ باقی رات بڑے ملال میں گزاری اور صبح سارے کام چھوڑ پہلے باپ کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔

شہزادی :۔ ابا جان! یہ آپ نے کس کے ساتھ میری تقدیر پھوڑ دی۔ امی جان زندہ ہوتیں تو کیا آپ ایسا ہی کرتے؟

بادشاہ : کیا ہوا؟

شہزادی: میں پوچھتی ہوں کہ کیا مری ہوئی ماں کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے!

بادشاہ : بات تو کہو؟

شہزادی: غریب آدمی بھی بیٹی کو گھر کا کوڑا سمجھ کر کوڑے پر نہیں پھینک دیتے۔

بادشاہ : بیٹی آخر بات کیا ہے؟

شہزادی: بات کیا ہو گی۔ آپ نے اپنے خاندان کو دھبا لگا لیا۔ دیکھا نہ بھالا ایک راہ چلتے کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دیا۔

بادشاہ : راہ چلتے کیا نجیب و شریف نہیں ہوتے اس کی صورت پر نہ جاؤ اللہ نے جیسا بنا دیا۔

شہزادی: مگر وہ تو معمولی درزی ہے۔ مجھ پر رات کو ساری حقیقت کھل گئی۔ قدرت نے دھوکے کی ٹٹی ہٹا دی۔ اور شہزادی نے سارا قصہ بیان کیا جو بونے درزی نے خواب میں کہا تھا۔

بادشاہ : ہائیں وہ بدمعاش درزی ہے۔

شہزادی: یقینی طور پر۔ خود اس کے ضمیر نے سونے میں اقرار کیا۔

بادشاہ: غضب ہوا۔

شہزادی: ابا جان خدا کے لیے مجھے اس سے بچایئے میں ایک درزی کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی جب تک بات پردے میں تھی کسی کو کچھ خیال نہ تھا۔ اب پردہ اٹھ گیا ہے۔ قریب ہے کہ ہمیں ذلت کا منہ دیکھنا پڑے۔ جو سنے گا کیا کہے گا۔

یہ سن کر بادشاہ کے حواس جاتے رہے۔ ایک نئی فکر اسے دامنگیر ہو گئی تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔

بادشاہ: اچھا تم ملول نہ ہو۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔

شہزادی: مجھے تو رات سے کھانا پینا حرام ہو گیا ہے۔ اگر میری جان آپ کو پیاری ہے تو اس سے چھٹکارا دلایئے۔

بادشاہ: آج دن بھر بھی تم صبر نہیں کر سکتیں۔

شہزادی: پھر کیا ہوگا؟

بادشاہ: اس کا کام تمام۔ کل صبح کو اس کی لاش دریا میں بہہ رہی ہوگی۔

شہزادی: کیوں کر؟

بادشاہ: رات کو تم اپنے سونے کے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دینا میرے آدمی باہر تلواریں سونتے موجود ہوں گے۔ جب وہ بے خبر سو جائے گا۔ تو آدمی اندر آ کر اسے باندھ لیں گے۔ اگر جاگ پڑا تو وہیں کام تمام ہے ورنہ دریا میں لے جا کر ڈبو دیں گے۔

شہزادی خوش ہو گئی کہ بارہ گھنٹے گزارنے ہی کیا۔ اور ہنسی خوشی اپنے محل میں جا براجی۔ لیکن درزی صاحب اب بادشاہ تھے اور ان دونوں باپ

بیٹی سے زیادہ ہوشیار اس نے ہر جگہ اپنے جاسوس لگا رکھے تھے۔ ادھر یہ باتیں ہوئیں اُدھر اس کے آدمیوں نے سارا قصّہ جا سنایا۔

درزی صاحب نے یہ سازش سن کر اپنے آدمیوں سے کہا " اب تم کیا چاہتے ہو" سب ایک زبان ہو کر بولے "جو حکم ہو ہم اپنا خون آپ کے پسینے پر گرانے کو تیار ہیں۔ اشارے کی دیر ہے کہیے تو ابھی غدر مچا دیں"۔

درزی: غدر مچانے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلا ہی اس بے وقوف بڈھے بادشاہ کے منصوبوں کو خاک میں ملا دینے کے لیے کافی ہوں۔ تم تو سیر دیکھتے رہو رات آنے دو۔ صبح کو معلوم ہو جائے گا کہ کون ہارا اور کون جیتا۔

الغرض رات آئی اور بونے درزی صاحب جو اب بادشاہ تھے بڑے بے فکری کے ساتھ اپنے معمول کے مطابق وقت پر اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے اور چھپر کھٹ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں گویا نیند آ گئی۔

شہزادی نے جب سمجھ لیا کہ درزی سو گیا ہے تو دبے پاؤں جا کر کواڑ کھول دیے اور اسی طرح آ لیٹی۔

بونے درزی صاحب مکاری سے آنکھیں بند کیے پڑے رہے۔ گویا نیند میں بالکل بے خبر ہیں۔ شہزادی کو اس کے سونے کا پورا یقین تھا۔ چند منٹ کے بعد نہایت صاف آواز میں بولنا شروع کیا جیسے کوئی خواب میں باتیں کرتا ہے کہ ارے قمیص ہی کو لپٹا ہوا ہے۔ میں نے کیا کہا تھا پہلے پتلون کے کاج بنا۔ بابوجی آتے ہوں گے۔ ہائیں ہائیں یہ کیسے غلط پھندے لگا رہا ہے۔ دوں ایک تھپڑ۔ جانتا نہیں میں ایک ہاتھ میں سات کا خاتمہ کر چکا ہوں۔ دو پہاڑ کے برابر دیو میں نے مارے ہیں۔ ارنے گھوڑے کو ایک شکاری میں پکڑ لایا۔ اور جنگلی سور کی میرے مقابلے میں ماں مر گئی ہیں بھلا ان چار چار روپے کے سپاہیوں سے

ڈروں گا جو میرے دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔

بادشاہ کے آدمیوں نے درزی کی یہ باتیں سنیں تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ جیسے چنگیز خاں کا لشکر آگیا اور اس دن کے بعد پھر بھی درزی صاحب کے سامنے پڑنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔

بادشاہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی دم بخود رہ گیا۔ شہزادی صاحبہ کو بھی درزی کی بیوی بن کر رہنے میں کوئی عذر نہ ہوا لہٰذا بوتے درزی کی مخالفت میں ایک لفظ بھی کسی کی زبان سے نہ سنا۔ یہ کس میں طاقت تھی کہ انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔

لہٰذا بوتے درزی صاحب مکھیوں کی بدولت موج اڑانے لگے اور تخت شاہی پر ایسے جمے کہ مرنے کے بعد ہی اُترے۔

بچوں کا پرانا ساتھی

ماھنامہ

پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

○ دلچسپ، حیرت انگیز اور پر اسرار کہانیاں
○ سائنسی اور مذہبی معلومات
○ کارٹون، لطیفے اور مزاحیہ مضامین
○ تاریخ، جغرافیہ
○ شہریت کے آداب

۱۹۲۶ء سے شائع ہو رہا ہے

پر دلچسپ انداز میں

بہترین [illegible]

ماہنامہ پیام تعلیم

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵